جسٹس ایس اے رحمٰن صاحب کا دوسرا مکتوب گرامی

مکرمی صدیقی صاحب!

سلام مسنون۔ "ترجمان القرآن" کا شمارہ بابت ماہِ اکتوبر موصول ہوا۔ اس میں میرا مرسلہ خط شائع کیا گیا ہے اور اس رعایت کے لیے ممنونِ احسان ہوں۔ جو تصریحات آپ نے خط کے بعد اپنی طرف سے شامل کی ہیں وہ پھر اسی ذہنیت کی غمازی کر رہی ہیں جو میرے لیے وجۂ شکایت ہوئی۔ میری صاف گوئی معاف ہو تو عرض کروں کہ آپ کی تصریحات میں متعدد مقامات پر تضاد ہے اور اگر میں آپ کی تحریر کا تجزیہ کرنے بیٹھ جاؤں تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ خط لکھنے سے میرا مقصود اپنی پوزیشن صاف کرنا تھا نہ کہ کسی مذہبی بحث یا مناظرہ کا آغاز کرنا۔ اگر میری تقریر کے اس ملخص میں جو میں نے انجمن کی شائع کردہ روداد سے لیا اور اس مزعومہ اقتباس میں جو مجھ سے آپ نے منسوب کیا، آپ کو باوجود تسلیم کردہ اختلافِ الفاظ کوئی فرق نظر نہیں آیا تو میں سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ ؎

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات

دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ میرے مرسلہ اقتباس کو دوبارہ پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ اگر آپ بغیر اس معہودِ ذہنی کے جو آپ کی غلط فہمی کا میرے نزدیک باعث ہوا ہے، اسے پھر پڑھیں تو آپ پر انشاء اللہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ بہتر تو یہ ہوتا (اور میں متوقع تھا کہ آپ ایسا کریں گے) کہ آپ فراخدلی سے میری تقریر کے فرضی اقتباس سے متعلق اپنی برأت اس طرح کرتے کہ آپ نے ناحق کسی راوی کی روایت پر اعتماد کر لیا۔ اور اس ناچیز پر فتوائے کفر صادر کرنے میں عجلت سے کام لیا۔ لیکن دیکھتا یہ ہوں کہ باوجود اس اعتراف کے کہ آپ سے "بعض مقامات پر کچھ زیادتی" ہوئی ہے آپ اس دعویٰ پر مُصر ہیں کہ میں نے وہی کچھ کہا ہے جو آپ کی دانست میں تجدد پسند

"متنفر مجلس" سے منسوب ہو سکتا ہے۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر آپ نے مجھے ایک طویل لیکچر پلانے کی زحمت اٹھائی ہے۔

میں تفصیلی جواب سے احتراز کرتا ہوں لیکن چند اشارات محض اس غرض سے کر رہا ہوں تاکہ میرا موقف آپ کی سمجھ میں آسکے۔

(۱) آپ نے میرے مرسلہ اقتباس کے ایک فقرہ پر اعتراض کیا ہے جس میں درج ہے کہ "قرآن کریم سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون کی جزئیات میں تبدیلی کرنے کی اجازت دی ہے"۔ غالباً یہاں انجمن کے روئداد نویس صاحب چند ایک الفاظ میری تقریر کے حذف کر گئے ہیں (تقریر ظاہر ہے کہ من و عن نقل نہیں ہو سکتی تھی)۔ میرا مقصود ہرگز یہ نہ تھا کہ یہ رائے کسی نص قرآنی پر مبنی ہے۔ ثبوت دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک صریحی متن سے اور ایک اس کے مضمر تضمنات سے (جسے انگریزی میں Necessary implication کہتے ہیں)۔ یہاں ظاہر ہے کہ میری مراد دوسرے قسم کے طرز استدلال سے تھی۔ اور آپ بے سود لفظی نزاع کی بھول بھلیوں میں جا پڑے ہیں۔ غالباً اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ عرف اور ذخائر فقہ قرآن حکیم میں لفظاً درج نہیں ہیں۔ استنباطی مسائل جو بزرگوں نے قرآن کریم سے اخذ کیے بہر حال رائے اور قیاس کے اثرات سے تہی نہیں۔ اس لیے تقلید کے مقابلے میں اجتہاد کا دروازہ ہر زمانے میں کھلا رہنا چاہیے۔ آپ میری شرط "قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے" کو نظر انداز نہ کیجیے۔ معاذ اللہ میں نے خدائے قدوس سے ایسی کوئی بات منسوب کرنے کی جسارت نہیں کی جس کا شبہ آپ کو ہوا۔ "وقتی تقاضوں اور مصلحتوں" کے الفاظ جو آپ نے استعمال کیے وہ بھی متعدد معانی کے حامل ہیں اور اسی لیے گمراہ کن ہیں۔ میرا مقصود یہ ہرگز نہیں کہ قرآنی حدود سے باہر نکل کر محض دنیاوی مصلحتوں کے پیش نظر من مانے اصول و قوانین وضع کیے جائیں۔ نہ میں نے یہ کہا ہے کہ جو امور کلی یا جزئی طور پر قرآن میں طے کر دیئے گئے ہیں اُن میں ہم ردو بدل کر لینے کے مجاز ہیں۔ رونا تو یہی ہے کہ آپ ایک بات فرض کر لیتے ہیں اور پھر بزعم خود اس کے خلاف قلمی جہاد شروع کر دیتے ہیں۔ تفسیر قرآن الگ موضوع ہے اور آپ تسلیم کریں گے کہ اس بارے میں پہلے بزرگ بھی اختلاف کر چکے ہیں۔

(۲) اکابر ائمہ کے سلسلہ میں مَیں نے کوئی مفروضہ قائم نہیں کیا بلکہ معاف کیجیے مفروضہ آپ قائم کر کے مجھ سے منسوب فرما رہے ہیں۔ مَیں نے بطورِ حقیقت یہ بات کہی تھی کہ ہمارے اکابر ائمہ نے مبرا عن الخطا ہونے کا دعویٰ یا عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اسی لیے ہو سکتا ہے کہ جو مصالح اُن کے پیشِ نظر ہوں بمرورِ زمانہ اُن میں تبدیلی واقع ہو چکی ہو اور ہمیں اُن کی آراء پر نظرِ ثانی کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس بارے میں میرا کوئی دل پسند نظریہ نہیں جسے میں حق بجانب ثابت کرنا چاہتا تھا۔ مَیں تو عصرِ حاضر کے مسلمانوں کے لیے بھی وہی حق طلب کر رہا ہوں جسے ابنِ تیمیہؒ سے لیکر علامہ اقبالؒ تک کئی روشن خیال بزرگوں نے جمودِ ملّی کے نقیض کے طور پر پیش کیا ہے۔ جیسا کہ آپ نے خود اعتراف کیا ہے کہ "ہمارے اس دور کا ہر لکھا پڑھا مسلمان اپنے پرانے علمی و فقہی ورثہ کا جائزہ لینے اور نئی ضرورتوں کے پیشِ نظر مناسب تبدیلیاں کرنے کا خواہشمند ہے اور یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کرتا۔" مَیں نے اگر اسی بات کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے تو کیوں گردن زدنی ہو گیا؟

(۳) رہا آپ کا یہ مسلک کہ تبدیلی اسی حد تک محدود رہے کہ کوئی شخص یا گروہ دلائل و براہین سے ثابت کر دے کہ ائمہ کرام کا فلاں فلاں استنباط قرآن و سنت کے مطابق نہیں ہے۔ جہاں تک قرآنِ حکیم کا تعلق ہے تفسیر و تعبیر کا حق برقرار رکھتے ہوئے ہر شخص اس سے اتفاق کرے گا۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں سنت کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ غالباً آپ انکار نہیں کریں گے کہ متعدد احادیث موضوعہ متداولہ مجموعوں میں شامل ہو گئی ہیں اور اس موضوع پر ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مَیں اس معاملہ میں بھی افراط و تفریط کا قائل نہیں۔ سننِ متوارث جن کا تعلق طریقِ عبادات مثلاً نماز یا مناسکِ حج وغیرہ سے ہے ان کی حیثیت مصئون و مامون ہے۔ لیکن باقی ماندہ موادِ احادیث روایت کے ساتھ درایت کے اصولوں پر پرکھا جانا چاہیے بیشتر اس کے کہ اس کی حجیت قبول کر لی جائے۔ مَیں تاریخی تنقید کا قائل ہوں۔

(۴) "قرآنِ مجید قانون کی کتاب نہیں" حیرت ہے کہ میری تقریر میں وضاحتِ الفاظ کے علی الرغم آپ نے اس کے متعلق سوال اٹھایا ہے۔ میرا مقصد ظاہر ہے کہ اصطلاحی قانون (جس کی تعریف سے مروجہ قانون کی کتابوں کا شناسا بخوبی واقف ہے) اور اخلاقی قانون کے درمیان امتیاز کرنا تھا۔ قرآن اُن معنوں

ہیں "قانون" کی کتاب نہیں جن معنوں میں "تعزیرات پاکستان" یا "ضابطۂ دیوانی" قانون کی کتابیں ہیں۔ قرآن کا مرتبہ ایسی کتابوں سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ اس میں ایک حصہ قانون کا بھی ہے لیکن بحیثیت مجموعی یہ کتاب "قانونِ زندگی" ہے یعنی مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ معاف کیجیے آپ نے محض "مولویانہ" انداز سے اس فقرہ پر تعریض کی ہے۔

امید ہے ان گذارشات کے بعد آپ کے دل سے رفعِ اشتباہ ہو گیا ہو گا کہ میرا موقف کیا ہے۔ اگر آپ یہ خط بھی ترجمان القرآن میں شائع فرما دیں تو قارئینِ رسالہ کسی ممکنہ غلط فہمی سے محفوظ ہو جائیں گے۔

آخر میں معذرت خواہ ہوں کہ میں پہلے خط میں کسی قدر تلخ لہجۂ بیان اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔ اہلِ علم کا احترام ہمیشہ مجھے ملحوظِ خاطر رہا ہے اور ان شاء اللہ رہے گا۔ لیکن شغلِ تکفیر کو جو بدقسمتی سے ہماری تاریخ میں اکثر و بیشتر تشتت و افتراق کا موثر ذریعہ بنا رہا، بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھ سکتا۔ اس اختلاف کا واسطہ دیتے ہوئے جسے نبی کریمؐ نے امت کے لیے رحمت کہا تھا، آپ سے بھی درخواست کروں گا کہ اس بارے میں حزم و احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

نیاز کیش

عبدالرحمٰن

تبصرہ

از ابوالاعلیٰ مودودی

جناب ایس اے رحمٰن صاحب کا یہ عنایت نامہ ان کی خواہش کے احترام میں یہاں درج کر دیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ ایک مباحثہ کو بلا نہایت چلانا مناسب نہیں ہے اس لیے میں نے پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب سے گذارش کی ہے کہ وہ اس سلسلے کو ختم کر دیں اور مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے میری اس گذارش کو قبول کر لیا ہے۔ لیکن فاضل مکتوب نگار نے اپنے موقف کی وضاحت فرماتے ہوئے

نمبروار چنداشارات فرمائے ہیں ان میں سے نمبر ۳ کچھ بحث طلب ہے، کیونکہ اپنی موجودہ مختصر صورت میں وہ بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر سکتا ہے۔ اس لیے میں خود اس کے متعلق کچھ باتیں اس توقع کے ساتھ ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ وہ ان پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں گے۔

صدیقی صاحب نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ائمۂ سلف کی مرتب کردہ فقہ پر نظر ثانی اگر کی جا سکتی ہے تو صرف اس بنیاد پر کہ ان کا کوئی اجتہاد و استنباط قرآن و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ فاضل مکتوب نگار اس کے متعلق فرماتے ہیں:

"جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے تفسیر و تعبیر کا حق برقرار رکھتے ہوئے ہر شخص اس سے اتفاق کرے گا لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں سنت کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔"

ان الفاظ سے یہ گمان ہوتا ہے کہ موصوف کے نزدیک قرآن تو اسلامی احکام معلوم کرنے کے لیے ضرور مرجع و سند ہے مگر وہ سنت کو یہ حیثیت دینے میں اس بنا پر متأمل ہیں کہ اس کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اب یہ بات ان کے بیان سے واضح نہیں ہوتی کہ اس مسئلے میں کیا چیز مختلف فیہ ہے؟ اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ بجائے خود سنت (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل اور امر و نہی) کا ماخذِ قانون اور مرجعِ احکام ہونا ہی مختلف فیہ ہے تو میں عرض کروں گا کہ یہ ایک خلافِ واقعہ بات ہے۔ جس روز سے امتِ مسلمہ وجود میں آئی ہے اس وقت سے آج تک یہ بات اہلِ اسلام میں کبھی مختلف فیہ نہیں رہی ہے۔ تمام امت نے ہمیشہ اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مومنوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطاع اور متبوع ہیں، ان کے حکم کی اطاعت اور ان کے امر و نہی کا اتباع ہر مسلمان پر واجب ہے، جس طریقے پر چلنے کی انہوں نے اپنے قول و عمل اور تقریر سے تعلیم دی ہے اس کی پیروی پر ہم مامور ہیں، اور زندگی کے جس معاملے کا بھی انہوں نے فیصلہ کر دیا ہے اس میں کوئی دوسرا فیصلہ کر لینے کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ تاریخ اسلام کے گذشتہ ۱۳۹۱ سال میں کس نے اور کب اس سے اختلاف کیا ہے۔ نرالی اپج نکالنے والے کچھ منفرد اور شاذ قسم کے خبطی تو دنیا میں ہمیشہ ہر گروہ میں پائے جاتے رہے ہیں۔ اس طرح کے افراد نے کبھی مسلماتِ قوم

کے خلاف کوئی بات کر دی ہو تو اس کی بنا پر یہ کہہ دینا صحیح نہیں ہے کہ ایک عالمگیر مسلمہ مختلف فیہ ہو گیا ہے اس لیے وہ مسلمہ نہیں رہا۔ اس طرح تو خبطیوں کی تاختت سے قرآن بھی نہیں بچا ہے سمجھنے والے تحریف قرآن تک کا دعویٰ کر بیٹھے ہیں۔ اب کیا ان کی وجہ سے ہم کلام الٰہی کے مرجع و سند ہونے کو بھی مختلف فیہ مان لیں گے؟

لیکن اگر مختلف فیہ سنت کا بجائے خود مرجع و سند ہونا نہیں ہے بلکہ اختلاف جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے اور ہوا ہے وہ اس امر میں ہے کہ کسی خاص مسئلے میں جس چیز کے سنت ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو وہ فی الواقع سنت ثابتہ ہے یا نہیں، تو ایسا ہی اختلاف قرآن کی آیات کے مفہوم و منشا میں بھی واقع ہوتا ہے۔ ہر صاحب علم یہ بحث اٹھا سکتا ہے کہ جو حکم کسی مسئلے میں قرآن سے نکالا جا رہا ہے وہ درحقیقت اس سے نکلتا ہے یا نہیں۔ فاضل مکتوب نگار نے خود قرآن مجید میں اختلاف تفسیر و تعبیر کا ذکر کیا ہے اور اس اختلاف کی گنجائش ہونے کے باوجود وہ بجائے خود قرآن کو مرجع و سند مانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسی طرح الگ الگ مسائل کے متعلق سنتوں کے ثبوت و تحقیق میں اختلاف کی گنجائش ہونے کے باوجود فی نفسہٖ "سنت" کو مرجع و سند تسلیم کرنے میں انہیں کیوں تامل ہے۔

یہ بات ایک ایسے فاضل قانون داں سے جیسے کہ محترم مکتوب نگار ہیں، مخفی نہیں رہ سکتی کہ قرآن کے کسی حکم کی مختلف ممکن تعبیرات میں سے جس شخص، ادارے یا عدالت نے تفسیر و تعبیر کے معروف علمی طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر جس تعبیر کو حکم کا اصل منشا قرار دیا ہو اس کے علم اور دائرۂ کار کی حد تک وہی حکم خدا ہے اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حقیقت میں بھی وہی حکم خدا ہے۔ بالکل اسی طرح سنت کی تحقیق کے علمی ذرائع استعمال کر کے کسی مسئلہ میں جو سنت بھی ایک فقیہ، یا لیجسلیچر یا عدالت کے نزدیک ثابت ہو جائے وہی اس کے لیے حکم رسول ہے اگرچہ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت میں رسولؐ کا حکم وہی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں یہ امر تو ضرور مختلف فیہ رہتا ہے کہ میرے نزدیک خدا یا رسول کا حکم کیا ہے اور آپ کے نزدیک کیا، لیکن جب تک میں اور آپ خدا اور اس کے رسول کو آخری سند (Final authority) مان رہے ہیں، ہمارے درمیان یہ امر مختلف فیہ نہیں ہو سکتا کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم بجائے خود ہمارے لیے قانون واجب الاتباع ہے۔ لہٰذا میں جناب ایس اے رحمان صاحب کی یہ بات سمجھنے سے معذور ہوں کہ

احکامِ فقہ کی تحقیق میں وہ قرآن کو تو اُن اختلافات کے باوجود مرجع وسند مانتے ہیں جو اس کے منشا کی تعیین میں واقع ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں مگر سنت کو یہ حیثیت دینے میں اس بنا پر تامل کرتے ہیں کہ جزئیاتِ مسائل کے متعلق سنتوں کے متشخص کرنے میں اختلافات واقع ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔

آگے چل کر صاحبِ موصوف سنت کو سند قرار نہ دینے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ "متعدد احادیثِ موضوعہ متداولہ مجموعوں میں شامل ہو گئی ہیں" اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اس موضوع پر ضخیم کتابیں بھی لکھی گئی ہیں" بظاہر اس ارشاد سے ان کا مدعا یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنت ایک مشکوک چیز ہے۔ ممکن ہے کہ یہ شبہ اختصارِ بیان کی وجہ سے پیدا ہوتا ہو اور فی الواقع ان کا مدعا یہ نہ ہو۔ لیکن اگر ان کا مدعا یہی ہے تو میں عرض کروں گا کہ وہ اس مسئلے پر مزید غور فرمائیں۔ انشاء اللہ انہیں خود محسوس ہو گا کہ جس چیز کو وہ سنت کے مشکوک ہونے کی دلیل سمجھ رہے ہیں وہی در اصل اس کے محفوظ ہونے کا اطمینان دلاتی ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لیے اس سوال کو چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ کونسے متداول مجموعے ہیں جن میں احادیثِ موضوعہ شامل ہو گئی ہیں۔ اگرچہ مختلف محدثین نے جو مجموعے بھی مرتب کیے ہیں ان میں اپنی حد تک پوری چھان بین کر کے انہوں نے یہی کوشش کی ہے کہ قابلِ اعتماد روایات جمع کریں، مگر اس معاملے میں صحاح ستہ اور مؤطا کا پایہ جس قدر بلند ہے وہ اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تاہم تھوڑی دیر کے لیے ہم یہ مان بھی لیں کہ سب مجموعوں میں موضوعات نے کچھ نہ کچھ راہ پالی ہے تو غور طلب بات یہ ہے کہ وہ "ضخیم کتابیں" جن کا ذکر فاضل مکتوب نگار کر رہے ہیں آخر ہیں کس موضوع پر۔ ان کا موضوع یہی تو ہے کہ کون کون سی حدیثیں وضعی ہیں، کون کون سے راوی کذاب اور وضاع حدیث ہیں، کہاں کہاں موضوع احادیث نے راہ پائی ہے، کس کتاب کی کون کون سی روایات ساقط الاعتبار ہیں، کن راویوں پر ہم اعتماد کر سکتے ہیں اور کن پر نہیں کر سکتے، "موضوع" کو "صحیح" سے جدا کرنے کے طریقے کیا ہیں، اور روایات کی صحت، ضعف، علت وغیرہ کی تحقیق کن کن طریقوں سے کی جا سکتی ہے۔ ان ضخیم کتابوں کی اطلاع پا کر تو ہمیں امن کا ویسا ہی اطمینان حاصل ہوتا ہے جیسا کسی کو یہ سن کر ہو کہ بکثرت چور پکڑ لیے گئے ہیں، بڑے بڑے جیل خانے ان سے بھر گئے ہیں، بہت سے اموالِ مسروقہ برآمد کیے گئے ہیں اور سراغرسانی کا ایک باقاعدہ انتظام موجود ہے جس سے آئندہ بھی چور پکڑے جا سکتے ہیں۔ لیکن تعجب کی بات ہو گی اگر کسی کے لیے یہی اطلاع

الٹی بے اطمینانی کی موجب ثابت ہو اور وہ اسے بدامنی کے ثبوت میں پیش کرنے لگے۔ بے شک بڑی مثالی حالتِ امن ہوتی اگر چوری کا سرے سے کبھی وقوع ہی نہ ہوتا۔ بلاشبہ اس طرح کی واردات ہو جانے سے کچھ نہ کچھ بے اطمینانی تو پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن مکمل حالتِ امن زندگی کے اور کس معاملے میں ہم کو نصیب ہے جو یہاں ہم اسے طلب کریں۔ جس حالت پر ہم دنیا میں بالعموم مطمئن رہتے ہیں اس کے لیے اتنا امن کافی ہے کہ چوروں کی اکثریت پکڑ کر بند کر دی جائے اور جو قلیل تعداد ابھی آزاد پھر رہی ہو اس کے پکڑے جانے کا معقول انتظام موجود ہو۔ کیا ہمارے سپریم کورٹ کے فاضل جج سنت کے معاملے میں اتنے امن پر قانع نہیں ہو سکتے؟ کیا وہ اُس مکمل امن سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہیں جس میں سرے سے چوری کے وقوع ہی کا نام و نشان نہ پایا جائے؟

آخر میں فاضل محترم تحریر فرماتے ہیں:

"میں اس معاملہ میں بھی افراط و تفریط کا قائل نہیں۔ سننِ متوارثہ جن کا تعلق طریقِ عبادات مثلاً نماز یا مناسکِ حج وغیرہ سے ہے ان کی حیثیت مصئون و مامون ہے۔ لیکن باقی ماندہ موادِ احادیث روایت کے ساتھ درایت کے اصولوں پر پرکھا جانا چاہیے پیشتر اس کے کہ اس کی حجیت قبول کی جائے میں تاریخی تنقید کا قائل ہوں۔"

یہ ایک حد تک صحیح نقطۂ نظر ہے۔ لیکن اس میں چند امور ایسے ہیں جن پر میں ان محترم کو مزید غور و فکر کی دعوت دوں گا۔ جس تاریخی تنقید کے وہ قائل ہیں، فنِ حدیث اسی تنقید ہی کا تو دوسرا نام ہے۔ پہلی صدی سے آج تک اس فن میں یہی تنقید ہوتی رہی ہے اور کوئی فقیہ یا محدث اس بات کا قائل نہیں رہا ہے کہ عبادات ہوں یا معاملات، کسی مسئلے کے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت دی جانے والی کسی روایت کو تاریخی تنقید کے بغیر حجت کے طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ یہ فن حقیقت میں اس تنقید کا بہترین نمونہ ہے اور جدید زمانے کی بہتر سے بہتر تاریخی تنقید کو بھی مشکل ہی سے اس پر کوئی اضافہ و ترقی (Improvement) کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ محدثین کی تنقید کے اصول اپنے اندر ایسی نزاکتیں اور باریکیاں رکھتے ہیں جن تک موجودہ دور کے ناقدینِ تاریخ کا ذہن بھی ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر میں

بلاخوفِ تردید یہ کہوں گا کہ دنیا میں صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت اور ان کے دور کی تاریخ کا ریکارڈ ہی ایسا ہے جو اُس کڑی تنقید کے معیاروں پر کسا جانا برداشت کر سکتا تھا جو محدثین نے اختیار کی ہے؛ ورنہ آج تک دنیا کے کسی انسان اور کسی دور کی تاریخ بھی ایسے ذرائع سے محفوظ نہیں رہی ہے کہ ان سخت معیاروں کے آگے ٹھیر سکے اور اس کو قابلِ تسلیم تاریخی ریکارڈ مانا جاسکے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارے جدید زمانے کے اہلِ علم اس فن کا تحقیقی مطالعہ نہیں کرتے اور قدیم طرز کے اہلِ علم جو اس میں بصیرت رکھتے ہیں وہ اس کو عصرِ حاضر کی زبان اور اسالیبِ بیان میں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اسی وجہ سے باہر والے تو درکنار خود ہمارے اپنے گھر کے لوگ آج اس کی قدر نہیں پہچان رہے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علومِ حدیث میں سے اگر صرف ایک عِلَلِ حدیث ہی کے فن کی تفصیلات سامنے رکھ دی جائیں تو دنیا کو معلوم ہو کہ تاریخی تنقید کس چیز کا نام ہے۔ تاہم، میں یہ کہوں گا کہ مزید اصلاح و ترقی کا دروازہ بند نہیں ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ روایات کو جانچنے اور پرکھنے کے جو اصول محدثین نے اختیار کیے ہیں وہ حرفِ آخر ہیں۔ آج اگر کوئی اُن کے اصولوں سے اچھی طرح واقفیت پیدا کرنے کے بعد ان میں کسی کمی یا خامی کی نشان دہی کرے اور زیادہ اطمینان بخش تنقید کے لیے کچھ اصول معقول دلائل کے ساتھ سامنے لائے تو یقیناً اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ ہم میں سے آخر کون یہ نہ چاہے گا کہ کسی چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرار دینے سے پہلے اس کے سنت ثابت ہونے کا تیقن حاصل کر لیا جائے اور کوئی کچی پکی بات حضور کی طرف منسوب نہ ہونے پائے۔

احادیث کے پرکھنے میں روایت کے ساتھ درایت کا استعمال بھی، جس کا ذکر محترم مکتوب نگار نے کیا ہے، ایک متفق علیہ چیز ہے۔ اگرچہ درایت کے مفہوم، اصول اور حدود میں فقہاء و محدثین کے مختلف گروہوں کے درمیان اختلافات رہے ہیں، لیکن بجائے خود اس کے استعمال پر تقریباً اتفاق ہے اور دورِ صحابہ سے لیکر آج تک اسے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں جو بات پیشِ نظر رہنی چاہیے، اور مجھے امید ہے کہ فاضل مکتوب نگار کو بھی اس سے اختلاف نہ ہوگا، وہ یہ ہے کہ درایت صرف انہی لوگوں کی معتبر ہو سکتی ہے جو قرآن و حدیث اور فقہِ اسلامی کے مطالعہ و تحقیق میں اپنی عمر کا کافی حصہ صرف کر چکے ہوں، جن میں ایک مدت کی ممارست نے ایک تجربہ کار جوہری کی سی بصیرت پیدا کر دی ہو،

اور خاص طور پر یہ کہ جن کی عقل اسلامی نظامِ فکر و عمل کے حدود اربعہ سے باہر کے نظریات، اصول اور اقدار لیکر اسلامی روایات کو اُن کے معیار سے پرکھنے کا ڈھانک نہ رکھتی ہو۔ بلا شبہ عقل کے استعمال پر ہم کوئی پابندی نہیں لگا سکتے، نہ کسی کہنے والے کی زبان پکڑ سکتے ہیں۔ لیکن بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ اسلامی علوم سے کورے لوگ اگر اناڑی پن کے ساتھ کسی حدیث کو خوش آیند پاکر قبول اور کسی کو اپنی مرضی کے خلاف پاکر ردّ کرنے لگیں، یا اسلام سے مختلف کسی دوسرے نظامِ فکر و عمل میں پرورش پائے ہوئے حضرات یکایک اٹھ کر اجنبی معیاروں کے لحاظ سے احادیث کے ردّ و قبول کا کاروبار پھیلادیں، تو مسلم ملّت میں نہ ان کی درایت مقبول ہو سکتی ہے اور نہ اِس ملّت کا اجتماعی ضمیر ایسے بے تکے عقلی فیصلوں پر کبھی مطمئن ہو سکتا ہے۔ اسلامی حدود میں تو اسلام ہی کی تربیت پائی ہوئی عقل اور اسلام کے مزاج سے ہم آہنگی رکھنے والی عقل ہی ٹھیک کام کر سکتی ہے۔ اجنبی رنگ و مزاج کی عقل یا غیر تربیت یافتہ عقل بجز اس کے کہ انتشار پھیلائے کوئی تعمیری خدمت اِس دائرے میں انجام نہیں دے سکتی۔

سنّت کی جو تقسیم محترم مکتوب نگار نے "سنن متوارثہ جن کا تعلق طریقِ عبادات سے ہے" اور "باقی ماندہ موادِ احادیث" میں کی ہے، اور ان میں سے متقدم الذکر کو مصئون و مامون اور مؤخر الذکر کو محتاجِ تنقید قرار دیا ہے، اس سے اتفاق کرنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ بظاہر اس تقسیم میں جو تصوّر کام کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ جو طریقے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادات کے متعلق سکھائے تھے وہ تو امت میں عملاً جاری ہو گئے اور نسل کے بعد نسل ان کی پیروی کرتی رہی، اس لیے یہ "متوارثہ" سنتیں محفوظ رہ گئیں، باقی رہے دوسرے معاملاتِ زندگی تو ان میں حضورؐ کی ہدایات نہ عملاً جاری ہوئیں، نہ ان پر کوئی نظامِ تمدن و معاشرت کام کرتا رہا، نہ وہ بازاروں اور منڈیوں میں رائج ہوئیں، نہ عدالتوں میں ان پر فیصلے ہوئے، اس لیے وہ بس متفرق لوگوں کی سینہ بسینہ روایات تک محدود رہ گئیں، اور یہی مواد ایسا ہے کہ اب اس میں سے بڑی دیدہ ریزی کے بعد قابلِ اعتبار چیزیں تلاش کرنی ہونگی۔ فاضل مکتوب نگار کا تصوّر اگر اس کے سوا کچھ اور ہے تو میں بہت شکر گزار ہونگا کہ وہ میری غلط فہمی رفع کر دیں۔ لیکن اگر یہی ان کا تصوّر ہے تو میں عرض کرونگا کہ یہ تاریخ سنّت کی واقعی صورتِ حال سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد نبوت میں مسلمانوں کے لیے محض ایک پیر و مرشد اور واعظ نہیں تھے بلکہ عملاً ان کی جماعت کے قائد، رہنما، حاکم، قاضی، شارع، مربی، معلم سب کچھ تھے اور عقائد و تصورات سے لیکر عملی زندگی کے تمام گوشوں تک مسلم سوسائٹی کی پوری تشکیل آپ ہی کے بتائے سکھائے اور مقرر کیے ہوئے طریقوں پر ہوئی تھی۔ اس لیے یہ کبھی نہیں ہوا کہ آپ نے نماز روزے اور مناسکِ حج کی جو تعلیم دی ہو بس وہی مسلمانوں میں رواج پا گئی ہو، اور باقی باتیں محض وعظ و ارشاد میں مسلمان سن کر رہ جاتے ہوں۔ بلکہ فی الواقع جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ جس طرح آپ کی سکھائی ہوئی نماز فوراً مسجدوں میں رائج ہوئی اور اسی وقت جماعتیں اس پر قائم ہونے لگیں ٹھیک اسی طرح شادی بیاہ اور طلاق و وراثت کے متعلق جو قوانین آپ نے مقرر کیے انہی پر مسلم خاندانوں میں عمل شروع ہو گیا، لین دین کے جو ضابطے آپ نے مقرر کیے انہی کا بازاروں میں چلن ہونے لگا۔ مقدمات کے جو فیصلے آپ نے کیے وہی ملک کا قانون قرار پائے، لڑائیوں میں جو معاملات آپ نے دشمنوں کے ساتھ اور فتح پا کر مفتوح علاقوں کی آبادی کے ساتھ کیے وہی مسلم مملکت کے ضابطے بن گئے، اور فی الجملہ اسلامی معاشرہ اور اس کا نظامِ حیات اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ انہی سنتوں پر قائم ہوا جو آپ نے یا تو خود رائج کیں یا جنہیں پہلے کے مروّج طریقوں میں سے بعض کو برقرار رکھ کر آپ نے سنتِ اسلام کا جزء بنا لیا۔ یہ وہ معلوم و متعارف سنتیں تھیں جن پر مسجد سے لیکر خاندان، منڈی، عدالت، ایوانِ حکومت اور بین الاقوامی سیاست تک مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تمام ادارات نے حضورؐ کی زندگی ہی میں عملدرآمد شروع کر دیا تھا اور بعد میں خلفائے راشدین کے عہد سے لیکر دورِ حاضر تک ہمارے اجتماعی ادارات کا ڈھانچہ انہی پر قائم ہے۔ پچھلی صدی تک تو ان ادارات کے تسلسل میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی انقطاع رونما ہوا ہے تو صرف حکومت و عدالت اور پبلک لا کے ادارات عملاً درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر آپ "متوارث" سنتوں کی محفوظیت کے قائل ہیں تو عبادات اور معاملات دونوں سے تعلق رکھنے والی یہ سب معلوم و متعارف سنتیں متوارث ہی ہیں۔ ان کے معاملے میں ایک طرف حدیث کی مستند روایات اور دوسری طرف امت کا متواتر عمل، دونوں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ان میں

مسلمانوں کی بے راہ روی سے جو الحاقی چیز بھی کبھی داخل ہوئی ہے، علمائے امت نے اپنے اپنے دور میں بروقت "بدعت" کی حیثیت سے اس کی الگ نشاندہی کر دی ہے اور قریب قریب ہر ایسی بدعت کی تاریخ موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کس زمانے سے اس کا رواج شروع ہوا۔ مسلمانوں کے لیے ان بدعات کو سننِ متعارفہ سے ممیز کرنا کبھی مشکل نہیں رہا ہے۔

اِن معلوم و متعارف سنتوں کے علاوہ ایک قسم سنتوں کی وہ تھی جنہیں حضورؐ کی زندگی میں شہرت اور رواجِ عام حاصل نہ ہوا تھا، جو مختلف اوقات میں حضورؐ کے کسی فیصلے، ارشاد، امر و نہی، تقریر و اجازت، یا عمل کو دیکھ کر یا سن کر خاص خاص اشخاص کے علم میں آئی تھیں اور عام لوگ ان سے واقف نہ ہو سکے تھے۔ یہ سنتیں عبادات اور معاملات، دونوں ہی طرح کے امور سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ ان کا تعلق صرف معاملات سے تھا۔ ان سنتوں کا علم جو متفرق افراد کے پاس بکھرا ہوا تھا، امت نے اس کو جمع کرنے کا سلسلہ حضورؐ کی وفات کے بعد فوراً ہی شروع کر دیا، کیونکہ خلفاء، حکام، قاضی، مفتی اور عوام سب اپنے اپنے دائرہ کار میں پیش آمدہ مسائل کے متعلق کوئی فیصلہ یا عمل اپنی رائے اور استنباط کی بنا پر کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ہدایت تو موجود نہیں ہے۔ اسی ضرورت کی خاطر ہر اُس شخص کی تلاش شروع ہوئی جس کے پاس سنت کا کوئی علم تھا، اور ہر اُس شخص نے جس کے پاس ایسا کوئی علم تھا خود بھی اس کو دوسروں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھا۔ یہی روایتِ حدیث کا نقطۂ آغاز ہے، اور ۱۱ھ سے تیسری چوتھی صدی تک ان متفرق سنتوں کو فراہم کرنے کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ موضوعات گھڑنے والوں نے ان کے اندر آمیزش کرنے کی جتنی بھی کوششیں کیں وہ قریب قریب سب ناکام ہوگئیں، کیونکہ جن سنتوں سے کوئی حق ثابت یا ساقط ہوتا تھا، جن کی بنا پر کوئی چیز حرام یا حلال ہوتی تھی، جن سے کوئی شخص سزا پا سکتا تھا یا کوئی ملزم بری ہو سکتا تھا، غرض یہ کہ جن سنتوں پر احکام اور قوانین کا مدار تھا ان کے بارے میں حکومتیں اور عدالتیں اور افتاء کی مسندیں اتنی بے پروا نہیں ہو سکتی تھیں کہ یوں ہی اٹھ کر کوئی شخص قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیتا اور ایک حاکم یا جج یا مفتی اسے

مان کر کوئی حکم صادر کر دیا تھا۔ اسی لیے جو سُنتیں احکام سے متعلق تھیں ان کے بارے میں پوری چھان بین کی گئی، سخت تنقید کی چھلنیوں سے ان کو چھانا گیا، روایت کے اصولوں پر بھی انہیں پرکھا گیا اور درایت کے اصولوں پر بھی، اور وہ سارا مواد جمع کر دیا گیا جس کی بنا پر کوئی روایت مانی گئی ہے یا رد کر دی گئی ہے تاکہ بعد میں بھی ہر شخص اس کے رد و قبول کے متعلق تحقیقی رائے قائم کر سکے۔ ان سُنتوں کا ایک معتدبہ حصہ فقہاء اور محدثین کے درمیان متفق علیہ ہے، اور ایک حصے میں اختلافات ہیں۔ بعض لوگوں نے ایک چیز کو سنّت مانا ہے اور بعض نے نہیں مانا۔ مگر اس طرح کے تمام اختلافات میں صدیوں اہلِ علم کے درمیان بحثیں جاری رہی ہیں، اور نہایت تفصیل کے ساتھ ہر نقطۂ نظر کا استدلال اور وہ بنیادی مواد جس پر یہ استدلال مبنی ہے فقہ اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ آج کسی صاحبِ علم کے لیے بھی یہ مشکل نہیں ہے کہ کسی چیز کے سنت ہونے یا نہ ہونے کے متعلق تحقیق سے خود کوئی رائے قائم کر سکے۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ سنّت کے نام سے متوحش ہونے کی کسی کے لیے بھی کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ البتہ اُن لوگوں کا معاملہ مختلف ہے جو اس شعبۂ علم سے واقف نہیں ہیں اور جنہیں بس دور ہی سے حدیثوں میں اختلافات کا ذکر سن کر گھبراہٹ لاحق ہو گئی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ احادیث میں جو مواد احکام سے متعلق نہیں ہے بلکہ جس کی نوعیت محض تاریخی ہے، یا جو فِتَن، ملاحم، رِقاق، مناقب، فضائل، اور اسی طرح کے دوسرے امور سے تعلق رکھتا ہے، اس کی چھان بین میں وہ عرق ریزی نہیں کی گئی ہے جو احکامی سنتوں کے باب میں ہوئی ہے۔ اس لیے موضوعات نے اگر راہ پائی بھی ہے تو زیادہ تر انہی ابواب کی روایات میں پائی ہے۔ احکامی سُنتیں بے اصل اور جھوٹی روایتوں سے تقریباً بالکل ہی پاک کر دی گئی ہیں۔ ان سے تعلق رکھنے والی روایتوں میں ضعیف خبریں تو ضرور موجود ہیں مگر موضوعات کی نشاندہی مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے۔ اور اخبارِ ضعیفہ میں سے بھی جس کسی کو فقہ کے کسی اسکول نے قبول کیا ہے اس بنا پر کیا ہے کہ اس کے نزدیک وہ قرآن سے، سنن متعارفہ کے جانے پہچانے نظام سے اور شریعت کے جامع اصولوں سے مناسبت رکھتی ہے، یعنی روایۃً ضعیف ہونے کے باوجود درایۃً اس

میں معنی کی قوت موجود ہے۔

محترم مکتوب نگار کی چند سطروں پر یہ تفصیلی تبصرہ میں نے صرف اس لیے کیا ہے کہ یہ سطریں کسی عام آدمی کے قلم سے نہیں نکلی ہیں بلکہ ایک ایسے بزرگ کے قلم سے نکلی ہیں جنہیں ہمارے سپریم کورٹ کے جج کی بلند پوزیشن حاصل ہے۔ سنّت کی شرعی و قانونی حیثیت کے متعلق اس پوزیشن کے بزرگوں کی رائے میں ذرہ برابر بھی کوئی کمزور پہلو ہو تو وہ بڑے دُور رس نتائج پیدا کر سکتا ہے قریب کے زمانے میں سنت کے متعلق عدلیہ کی بعض دوسری بلند پایہ شخصیتوں کے ایسے ریمارک بھی سامنے آئے ہیں جو صحیح علمی نقطۂ نظر سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جو باتیں میں نے اس تبصرے میں عرض کی ہیں انہیں فاضل مکتوب نگار ہی نہیں، ہمارے دوسرے حکامِ عدالت بھی اُسی بے لاگ نگاہ سے ملاحظہ فرمائیں جس کی ہم اپنی عدلیہ سے توقع رکھتے ہیں۔